عہدِ حاضر میں دعوتِ اسلامی کی زبوں حالی

از عبد اللہ کنون ۔ گورنر طنجہ (مراکش)

[فاضل مقالہ نگار جناب عبد اللہ کنون دنیائے اسلام کی معروف علمی اور ادبی شخصیت ہیں مراکش کی جنگِ آزادی میں ان کا کافی حصہ ہے۔ استقلالِ مراکش سے پہلے طنجہ میں ایک اسلامی درسگاہ کے مدیر تھے، جس کے بانی بھی یہ خود ہی تھے طنجہ کی مجلسِ علمی کے صدر بھی تھے۔ جہادِ آزادی کے دوران جب طنجہ سے تطوان (مراکش کا اسپینی خطّہ) ہجرت کر گئے تو وہاں وزیر عدل کے عہدہ پر فائز ہوئے۔ موصوف طویل عرصہ تک تطوان کے علمی ریسرچ انسٹی ٹیوشن (معہد مولائے حسن) کے ڈائرکٹر بھی رہ چکے ہیں۔ ان تمام مشاغل کے ساتھ ساتھ ڈاکٹر تقی الدین ہلالی کے جاری کردہ ماہنامہ 'لسان الدین' کو بھی چلاتے رہے ہیں۔ آج کل طنجہ کے گورنر ہیں۔ آزادی کے بعد مراکش جس قسم کے سیاسی و اجتماعی حالات سے دوچار ہے ان میں اور پاکستان کے حالات میں بہت کم تفاوت نظر آتا ہے۔ چنانچہ اس مقالے کی اشاعت کا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ

خوشتر آں باشد کہ سرِ دلبراں گفتہ آید در حدیثِ دیگراں (خ-ح)

عصرِ حاضر میں دعوتِ اسلامی پر جو زبوں حالی و بے کسی طاری ہے۔ تاریخ کے کسی دور میں وہ ایسے حالات سے دوچار نہیں ہوئی اور عصرِ حاضر کے مدّعیانِ اصلاح کے ہاتھوں اس کی اقدار و خصائص کو جس طرح مسخ کیا گیا ہے۔ عہدِ ماضی میں اس کی کوئی مثال نہیں ملتی۔ امام بوصیری رحمہ اللہ کا قول "؟ ومن شدۃ الظھور الخفاء" (کسی چیز کا زیادہ نمایاں ہونا بھی اس کی پوشیدگی کا سبب بن جاتا ہے)، موجودہ بدتر حالات پر ــــ جن میں اسلام سراسیمہ ہو کر ٹامک ٹوئیاں مار رہا ہے مگر اس کے ماننے والے اُسے نشأۃ ثانیہ اور ترقی کی جانب گامزن سمجھ رہے ہیں ــــ جس صحت کے ساتھ صادق

آ رہا ہے پہلے کبھی نہ آیا ہوگا۔

دعوتِ اسلامی کے روشن ایام اس میں کوئی شک نہیں کہ دعوتِ اسلامی کا کاروان آغازِ سفر ہی میں سنگین مزاحمتوں سے دوچار ہوتا رہا ہے۔ اور روزِ اول ہی سے چندور چند مخالفتوں کے طوفان اس کی اقدار و ممیزات سے متصادم ہوتے رہے ہیں۔ چنانچہ ہجرتِ نبوی کا دور، بعد ہجرت کا مرانیہ کا دور، خلفائے راشدین کا زمانہ، اموی عہد اور پھر عصرِ عباسی جب کہ اسلامی تہذیب و تمدن پوری طرح اپنی جڑیں جما چکا تھا اور مسلمانوں کو علوم و فنون میں ید طولیٰ حاصل ہو چکا تھا، ان تمام ادوار میں دعوتِ اسلامی پر کبھی یہود کی چیرہ دستیاں، کبھی منافقین کی ریشہ دوانیاں، کبھی خوارج و معتزلہ کی طوفان خیزیاں اور کبھی باطنیہ، زنادقہ اور ملاحدہ کی کینہ توزیاں حملہ آور ہوتی رہی ہیں مگر ان سب کے علی الرغم دعوتِ اسلامی نے کبھی اپنی ڈگیں نہیں ڈالیں اور کسی موقع پر سرنگوں نہیں ہوئی۔ بلکہ ہر محاذ پر اس نے پہاڑ کی سی ثابت قدمی کے ساتھ ہر مزاحم قوت کو پسپا کیا، ہر مخاصمت کو حرفِ غلط کی طرح مٹایا اسے ہمیشہ غلبہ حاصل رہا اور اس کی صفوں کو ہدفِ انتشار بنانے کی ہر کوشش اس کی شیرازہ بندی کو مضبوط سے مضبوط تر کرنے کا موجب ہوئی۔ اس میں تغیر و تبدل کو کبھی راہ نہ مل سکی۔ جو کچھ تغیر ہوا وہ صرف اس کے ذرائع و وسائل میں ہوا۔ حالات کے تقاضوں اور ارتقاء کے عوامل کے تحت ہوا۔ رہا اصولوں کا تعلق تو ان میں کسی تبدیلی یا تحوّل کا سوال ہی پیدا نہیں ہوا۔ حالات و حوادث کے سخت حملوں کے باوجود اس کی اساسات قائم و دائم رہیں۔ جس نے بھی انہیں منہدم کرنے یا متزلزل کرنے کی جسارت کی اُسے دعوتِ اسلامی کی طرف سے سخت چیلنج دیا گیا ــــ اور اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد پوری شان کے ساتھ حالات پر چسپاں ہوتا رہا کہ "یُرِیْدُوْنَ اَنْ یُّطْفِـُٔوْا نُوْرَ اللّٰهِ بِاَفْوَاهِهِمْ وَاللّٰهُ مُتِمُّ نُوْرِهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْكٰفِرُوْنَ۔

جہاں تک عہدِ نبوت کا تعلق ہے، اس مبارک عہد میں دعوتِ اسلامی پر جو بحرانی کیفیات طاری ہوئیں اور رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے توفیقِ وحیِ الٰہی، کلمۃ اللہ کو بالاتر کرنے اور دوسرے تمام کلموں کو نگونسار کرنے کے لیے جو مثالی جہاد کیا ــــ حتیٰ کہ حق کامیاب ہوگیا اور باطل نامراد

ہوگیا اور جزیرۂ عرب میں کوئی ایسا متنفس باقی نہ رہا جو کفر و نفاق کے ساتھ بالا سر کو چل سکتا ہو ــــ اس کی مثالیں پیش کرنے کی ہم ضرورت نہیں سمجھتے۔ کیونکہ صاحبِ رسالت علیہ الصلوٰۃ والتسلیم نے جو کچھ کیا وہ آپ کے فرائض میں داخل تھا اور آپ کی مہم عظیم کا تقاضا تھا۔ قرآنِ کریم میں دعوتِ اسلامی کے ان مراحل و ایّام کی اور دینِ حق کے غلبہ و تفوق اور ہر گوشۂ ملک تک اُسے پہنچانے کے لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم کے تمام کارناموں اور قربانیوں کی طویل روداد موجود ہے۔ جو شخص اس معجز طراز اور حیرت افزا روداد کو معلوم کرنا چاہے وہ قرآن کے متعلقہ حصّوں کی طرف رجوع کر کے معلوم کر سکتا ہے۔

فتنۂ ارتداد یا دعوتِ اسلامی کی پہلی آزمائش دورِ خلافتِ راشدہ کی سب سے پہلی آزمائش جس کی بھٹی سے دعوتِ اسلامی کو گزرنا پڑا، فتنۂ ارتداد کا ظہور ہے جس میں بعض عرب قبیلوں نے زکوٰۃ ادا کرنے سے انکار کر دیا تھا اور زکوٰۃ کو ایک ایسا ٹیکس سمجھ بیٹھے تھے جو ان کی قید و بندش سے آزاد اور بے لگام بسر ہونے والی زندگی کے منافی تھا۔ لیکن خلیفۂ اوّل کے مدبّرانہ موقف کے طفیل یہ دعوت اس امتحان سے انتہائی استقامت کے ساتھ اور عظیم کامرانی اور سرخروئی کے ساتھ نکلی۔ حضرت ابوبکرؓ نے جب مانعین زکوٰۃ کے خلاف جہاد کا اعلان کیا تو صحابہ کی تمام جماعت نے مخالفت کی۔ حتیٰ کہ حضرت عمرؓ جیسے شخص نے بھی، جو سخت گیری اور غیرت مندی میں مشہور تھے، اس سے اختلاف کرتے ہوئے کہا: [تقاتلهم على الشاة والبعير؟ (کیا آپ بھیڑ بکریوں کی خاطر اُن کے خلاف تلوار اٹھانے لگے ہیں)، مگر ابوبکر صدیقؓ نے جواب دیا: "خدا کی قسم اگر یہ لوگ زکوٰۃ کی اس رسّی کو بھی دینے سے انکار کریں گے جو وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کو دیا کرتے تھے تو میں اس کی خاطر بھی ان سے لڑوں گا"۔ فی الواقع اگر حضرت ابوبکرؓ یہ مضبوط موقف اختیار نہ فرماتے تو زکوٰۃ کا حکم نسیاً منسیاً ہو جاتا اور اس کے بعد اسلام کے دوسرے اصول و ارکان بھی ایک ایک کر کے منہدم ہو جاتے اور آج ہمیں اسلام کا نام و نشان تک بھی نظر نہ آتا۔

انکارِ زکوٰۃ کا اجتماعی نقصان کیا تھا؟ انکارِ زکوٰۃ کا معاملہ صرف اتنا ہی نہ تھا کہ دین کا ایک

شعار معطّل کیا جا رہا تھا، بلکہ اس کا مطلب یہ بھی تھا کہ اللہ تعالیٰ نے مالداروں پر جو زکوٰۃ فرض کی ہے اُس سے غریبوں اور حاجتمندوں کو محروم کیا جا رہا ہے۔ اس لحاظ سے صدیقِ اکبر کی جنگ ہٹ دھرم سرمایہ داری کے خلاف تھی جو یہ سمجھ بیٹھی تھی کہ دنیا کے اندر جینے اور لذائذ دنیا سے لطف اندوز ہونے کا حق تنہا اُسی کو حاصل ہے۔ اور یہ فراموش ہو گیا کہ یہاں انسانوں کا ایک ایسا طبقہ بھی موجود ہے جو زندگی کی بنیادی ضروریات سے بھی تہی دست ہے اور لازم ہے کہ اس کی خبر گیری اور مواسات کی جائے تاکہ وہ اپنے پاؤں پر کھڑا ہو سکے۔

حضرت ابوذرؓ کی دعوتِ اشتراکیت عجیب اتفاق ہے کہ عہدِ خلافتِ راشدہ کا دوسرا حادثہ جو دعوتِ اسلامی کے لیے نئی آزمائش کا پیغام لے کر آیا، طبقۂ غربار کے اندر برپا ہوا اور قریب تھا کہ ملّت کے اجتماعی و اقتصادی نظام میں اسلامی اصولوں کے خلاف بغاوت بھڑکا دیتا۔ اس فتنہ نے طبقۂ غربار کے اندر اشتراکیت (سوشلزم) کے انتہا پسندانہ نظریہ — جو متمول انسانوں سے ان کی دولت اور مالکانِ اراضی سے ان کی زمین سلب کرنے کی کشمکش برپا کر دیتا ہے اور ان تمام امتیازی حدود کو پامال کر جاتا ہے جو انسانی سوسائٹی کے مختلف طبقات کے اندر عرف انسانی میں پشت ہا پشت سے مسلّم چلے آرہے ہوتے ہیں — کی تخم ریزی شروع کر دی۔ اور اسے بار آور ہونے کے لیے خاصا زرخیز میدان ہاتھ آگیا۔ اس نظریہ کے علمبردار جلیل القدر صحابی حضرت ابوذرؓ غفاری تھے۔ حضرت ابوذرؓ دمشق کی شاہراہوں اور چوکوں میں کھڑے ہو جاتے اور راہ گیروں سے پکار پکار کر کہتے: "بشرا لکانزین بنار یحمیٰ علیھا ما کنزوا فتکوی جباھھم وجنوبھم وظھورھم" (کانزوں کو اس آگ کی خوشخبری سنا دو جس سے ان کے خزانے تپائے جائیں گے اور انہی کی پیشانیوں اور پہلوؤں اور پیٹھوں کو داغا جائے گا)۔ اس مہم میں حضرت ابوذرؓ کے ساتھ ان کا ایک غلام بھی تھا۔ دونوں کے بدن پر یکساں لباس ہوتا تھا اور دونوں ایک ہی قسم کا کھانا ایک ہی جگہ مل کر کھاتے تھے۔ ان کی باتوں کو سننے کے لیے غریبوں اور فقیروں کے ٹھٹھ کے ٹھٹھ جمع ہو جاتے۔ ان کے افکار و خیالات سے ان شہروں کے مسلمان خاص طور پر دلچسپی

لینے لگے تھے جہاں دعوت اسلامی نے بھی اچھی طرح پاؤں نہیں جمائے تھے۔ چنانچہ ان کے اقوال بڑھا چڑھا کر پیش کیے جانے لگے اور ان کی جانب ایسی آراء منسوب کی جانے لگیں جن کے یہ خود بھی قائل نہ تھے۔ حضرت معاویہؓ، جو اس وقت شام کے گورنر تھے، حضرت ابوذرؓ کی مہم سے بڑے تنگ آگئے اور انہیں خدشہ لاحق ہو گیا کہ اگر یہ دعوت یونہی برقرار رہی تو ایک روز یہ ایسی طالع آزما کشمکش پر منتج ہو گی جسے موالی، پسماندہ طبقہ کے لوگ اور مفتوح علاقوں کے زخم خوردہ افراد برپا کر دیں گے۔ چنانچہ حضرت معاویہؓ نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے پاس یہ شکایت بھیجی۔ حضرت عثمانؓ نے حضرت ابوذرؓ کو مدینہ طلب کر لیا اور ان کے خیالات معلوم کیے اور جب ان پر یہ واضح ہو گیا کہ ابوذرؓ کی دعوت میں بہت بڑا خطرہ مضمر ہے تو آپ نے حضرت ابوذرؓ کو ربذہ نامی ایک الگ تھلگ بستی میں جلاوطن کر دیا اور اس طرح یہ خطرہ ٹل گیا۔

دعوت ابوذرؓ سے عام صحابہ کا اختلاف خلیفۂ ثالث کی طرف سے یہ ایسا کارگر اقدام تھا کہ اس کے بغیر کوئی صورت اسلام کے نظامِ حکومت کو اور شریعتِ مطہرہ کو بچانے والی نہ تھی۔ شریعت کا یہ مسلّم اور محکم اصول ہے کہ وہ شخصی ملکیت کا حق تسلیم کرتی ہے اور دولت کو ساجھے کی ہنڈیا بنانے کے بجائے وہ انسانی جان کی طرح اس کی حفاظت لازم ٹھہراتی ہے۔ البتہ خزانۂ ریاست وہ مشترکہ کھاتہ ہے جہاں سے ہر شخص اپنے مرتبہ و ضرورت کے مطابق اپنا حق وصول کرنے کا مجاز ہے۔ یا مالِ زکوٰۃ ہے جو شریعت نے صرف فقراء و مساکین کے لیے مخصوص کر دیا ہے۔ علاوہ ازیں شریعت تمام لوگوں کو دعوت دیتی ہے کہ وہ جائز طریقوں سے اپنی دولت و ثروت کی افزائش کریں۔ اور اگر وہ اپنے اوپر عائد شدہ حقوق و فرائض کو ادا کرتے رہیں تو وہ کسبِ مال کے لیے جس قدر چاہیں اپنے ذرائع و وسائل پھیلاتے جائیں۔ یہی بنیاد تھی جس کے پیش نظر تمام صحابہؓ نے حضرت ابوذرؓ کے مسلک سے براءت کا اظہار کیا۔ حضرت ابن عمرؓ فرمایا کرتے تھے: کل ما ادیت زکاتہ فلیس بکنز ولو کان تحت سبع ارضین (جس مال کی تو نے زکوٰۃ ادا کر دی ہو وہ کنز نہیں ہے، خواہ اسے سات زمینوں کے نیچے دبا رکھا ہو)۔ ہاں، بذل و سخا اور احسان و عطاء کے میدان میں مسابقت کی کوئی حد مقرر نہیں کی گئی بلکہ

مطلوب و مستحسن یہ ہے کہ مسلمان اس میدان میں بڑھ چڑھ کر ریکارڈ توڑیں۔ لیکن یہ مطالبہ برسبیلِ ترغیب و تشویق ہے نہ کہ بذریعہ جبر و اکراہ۔

صاحبِ ثروت صحابہ کا جذبۂ انفاق کتاب و سنت میں انفاق فی سبیل اللہ کے لیے اور کمزوروں اور ناداروں کی مواسات کے لیے جو کچھ ترغیبات مذکور ہیں یا بخل و تنگدلی سے جیسی کچھ نفرت دلائی گئی ہے اس سے کوئی شخص ناواقف نہیں ہے۔ حضرت ابوذرؓ نے انہی ترغیبات کو عزیمت پر محمول کیا اور اصلِ حکم قرار دیا لیکن دوسرے صحابہ — جن میں خلفائے راشدین بھی تھے اور عشرہ مبشرہ بھی — ان کی اس توجیہ کے خلاف تھے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ صحابہ میں زبیر بن عوام اور عبدالرحمن بن عوف جیسے بڑے بڑے صاحبِ ثروت لوگ بھی تھے۔ لیکن ان کا حال یہ تھا کہ جب انہیں صدقہ و خیرات کی دعوت دی جاتی تو وہ اللہ اور اس کے رسول کی رضا جوئی کے لیے ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کی کوشش کرتے۔ مثلاً حضرت ابوبکر صدیق رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی اپیل پر یکبارگی اپنا تمام سرمایہ حاضر کر دیتے ہیں اور جب حضورؐ ان سے دریافت فرماتے ہیں کہ ما ترکت لاولادک؟ (بال بچوں کے لیے کیا چھوڑا ہے) تو وہ جواب دیتے ہیں: ترکت لھم اللہ ورسولہ (اللہ اور رسول ان کے پاس چھوڑ آیا ہوں)۔ عمرؓ بن خطاب اپنی تمام پونجی کا نصف پیش کر دیتے ہیں۔ اور حضرت عثمانؓ — جنہوں نے حضرت ابوذرؓ کے مقابلے میں سرمایہ داروں کی حمایت کی تھی — دعوتِ اسلامی کی کامیابی کے لیے اتنا مال بارگاہِ رسالت میں نچھاور کر دیتے ہیں کہ اسے احاطۂ شمار میں لانا دشوار ہو جاتا ہے۔ حتیٰ کہ وہ پورے کا پورا لشکر (جیش العسرۃ) صرف اپنے مال سے تیار کر دیتے ہیں اور بارگاہِ نبوت سے ان کو یہ اعزاز عطا کیا جاتا ہے کہ ما ضر عثمان ما فعل بعد الیوم (آج کے بعد عثمان جو کچھ بھی کرے گا اسے نقصان نہیں پہنچے گا)۔

دونوں خلیفوں کے بروقت اقدام کی اہمیت میرا مدعا یہ ہے کہ اسلام، جو ہر صاحبِ حق کو اس کا پورا حق عطا کرتا ہے اور بے لچک سرمایہ داری اور انتہا پسند سوشلزم کے بین بین اعتدال کی راہ اختیار کرتا ہے۔ اسے اپنی دونوں آزمائشوں کے موقع پر دونوں خلیفوں کی ذات میں اپنی اقدار و ممیزات

کے وہ بہترین پاسبان میسر آ گئے۔ جونہی مالدار طبقہ نے فقراء و مساکین کو ان کے حقوق سے محروم کر دینے کی دھمکی دی خلیفۂ اول یکایک اُٹھے اور ان کی حمایت میں مالداروں کے خلاف علمِ جہاد بلند کر دیا۔ دوسری طرف جب اغنیاء کے خلاف طبقۂ فقراء کے غلط تصورات نے خطرے کا الارم بجایا تو خلیفۂ ثالث اغنیاء کا جانبدار ہو کر فقراء کے انقلابی عزائم سے ان کی حفاظت کے لیے اٹھ کھڑا ہوا۔ اور اس نے انتہا پسند مسلک کی بروقت سرکوبی کر دی، جو اگر کامیاب ہو جاتا تو معاشرۂ اسلامی کو زیروزبر کر کے رکھ دیتا۔ انتشار و فوضویت کا طوفان برپا ہو جاتا اور زمامِ حکومت پر فتنہ پردازوں کا قبضہ ہو جاتا۔

خوارج کا فتنہ اور اس کا استیصال آگے چل کر اسلام پھر خلیفۂ مظلوم حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے ایامِ خلافت میں ایک خطرے سے متصادم ہو جاتا ہے جس کی سنگینی اور ہلاکت خیزی نے سابقہ تمام خطرات کو مات کر دیا۔ یہ خوارج کا فتنہ تھا جو صرف اسلامی ریاست کے مالیاتی نظام کے تار و پود بکھیرنے تک اکتفا کرنے والا نہ تھا بلکہ جس کے بطن میں ملتِ اسلامی کے سیاسی، معاشرتی اور فکری ڈھانچے کا مکمل تیا پانچہ کر دینے کا سامان موجود تھا۔ چنانچہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے اپنے پورے دورِ خلافت میں خوارج کی سرکوبی میں کبھی تردد سے کام نہیں لیا بلکہ ہمیشہ ان کے خلاف معرکۂ قتال گرم رکھا۔ حتیٰ کہ آپ دین کی پاسبانی اور ملت کی شیرازہ بندی کرتے ہوئے جامِ شہادت نوش فرما گئے۔

اب حیرت ہوتی ہے ان لوگوں پر جو مانعینِ زکوٰۃ کے خلاف جہاد کو تو صحیح سمجھتے ہیں لیکن ملتِ اسلامی کی وحدت کو پارہ پارہ کرنے والوں کے خلاف تلوار اٹھانے سے انہیں اتفاق نہیں ہوتا، حالانکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے کہ اذا بویع لخلیفتین فاقتلوا الثانی منہما (جب دو خلیفوں کی بیعت تک نوبت پہنچ جائے تو دوسرے کی گردن اڑا دو) اور نہ ہی دینِ حق کے اندر ایسے افکار و نظریات تراشنے والوں کے خلاف ان کی رگِ حمیت میں حرکت آتی ہے، جن کی کتاب و سنت میں کوئی سند نہیں ہے۔ حالانکہ شارع علیہ السلام کا فیصلہ ہے کہ من احدث فی امرنا ھذا مالیس منہ فھو ردٌّ (جس نے دین میں کوئی ایسا طریقہ جاری کر دیا جو اس میں نہیں ہے تو اُسے رد کر دیا جائے گا)

حضرت علی خواہ حینِ حیات فتنۂ خوارج کے مہلک جراثیم کا عملی طور پر قلع قمع نہ کر سکے، لیکن

بحیثیت نظریہ آپ نے ان کی جڑ کاٹ دی۔ چنانچہ یہ اُن کے طرزِ عمل ہی کے اثرات ہیں کہ اُن کے بعد ہر دَور کے مسلمان ہمیشہ خوارج کے خلاف شمشیر برہنہ رہے ہیں۔ اور اسلامی پلیٹ فارم پر انہیں جگہ دینے کے کبھی روادار نہیں ہوئے ہیں۔ تاریخ کی شہادتیں موجود ہیں کہ اہل السنتہ والجماعۃ کے جھنڈے تلے خوارج کو کبھی پناہ نہیں مل سکی اور نہ اسلامی خلافت کے کسی دَور میں ان کی دال گل سکی۔

معتزلہ کا ظہور اور علماء کا ابتلاء خوارج کا اختلاف متعدد گمراہ فرقوں اور مسلکوں کو جنم دینے کا موجب ہوا، جیسے قدریہ، جبریہ اور مرجئہ وغیرہ۔ پھر انہی مذاہب کی تراش خراش سے ایک آخری گروہ برآمد ہوا جسے معتزلہ کہا جاتا ہے۔ ان فرقوں نے اپنے افکار کی تشہیر کے لیے تلوار کا استعمال نہیں کیا۔ بلکہ ایک نظریاتی جنگ چھیڑ دی۔ چنانچہ علمائے اسلام اور ائمۂ سنت اٹھے اور ان کے افکارِ فاسدہ کے مسموم تیروں سے قلعۂ اسلام کی حفاظت میں لگ گئے۔ اور ان کے تیروں کو انہی کے سینہ و جگر میں پیوست کرنے لگے۔ چنانچہ یہ علماء کی کوششوں کا نتیجہ ہے کہ ان مذاہب پر ہمیشہ مُردنی چھائی رہی ہے۔ پوری تاریخ میں صرف چند ایسے مواقع ملتے ہیں جن میں ان کو بعض حکمرانوں کی حمایت حاصل ہو جاتی رہی ہے۔ جو ان پر کچھ دیر کے لیے چہل پہل پیدا کر دیتی تھی لیکن آخر کو خزاں زدہ ہو جاتے رہے ہیں۔ اور قابل ذکر بات یہ ہے کہ انجام کار علمائے اسلام نے ان پر ایسی ضرب کاری لگائی کہ سوائے تاریخ کے فرقوں کے اور ملل و نحل کی کتابوں کے ان کا کہیں ذکر تک نہیں چھوڑا اور صدیاں گزر گئی ہیں لیکن ان کے پیرکاروں کا کہیں سراغ نہیں ملتا۔ حالانکہ وسیع پیمانے پر ان کی اشاعت کی گئی اور امراء و حکام کا ایک گروہ بھی ان کے دام فریب میں آکر ان کی پشت پناہی کرتا رہا ———— دراصل اس وقت اسلامی حمیّت زندہ تھی اور یہ اُسی کا کرشمہ تھا کہ اسلام کے جلیل القدر ائمۂ فکر ان مذاہب کے خلاف معرکہ آزما رہے اور انہوں نے فلسفہ و کلام کی فیصلہ کن جنگ لڑی جس کی وجہ سے ان حضرات کو گہرے زخم بھی آئے اور ناقابلِ برداشت اذیتوں کا بھی سامنا کرنا پڑا مگر انہوں نے بڑے دل گردے کے ساتھ سب کچھ برداشت کیا ———— یہ غیرتِ دین ہی کی تپش تھی کہ انہوں نے ان تجدد پسندانہ افکار اور گمراہ کُن نظریات کی جڑ کاٹ کر قیامت تک کے لیے انہیں پیوندِ خاک کر دیا۔ اور بالآخر دعوتِ

اسلامی کا پرچم اپنی اصل اقدار و خصوصیات کو جلو میں لیے دنیائے اسلام پر لہراتا رہا۔

مزید آزمائشیں ان کلامی معرکوں میں کیسے کیسے تلخ مجادلے و مناظرے ہوتے رہے یا یہ اعتزالی افکار رسول کی تعلیم سے کس حد تک منحرف تھے اور عقیدۂ اسلام کے لیے کیا کیا خطرات اپنی آستینوں میں رکھتے تھے یا سلف صالحین کے دینی اور دنیوی طریقوں سے کہاں کہاں متصادم ہوتے تھے؟ ان تفصیلات میں اگر ہم جائیں تو بات بہت طویل ہو جائے گی۔ جسے تفصیلات درکار ہوں وہ خود ان مضامین کی کتابوں سے رجوع کر کے معلوم کر سکتا ہے۔ ہمارے لیے اس مقام پر صرف اتنا ہی کافی ہے کہ ہم نے حاصلِ بحث کے طور پر، علماء کا وہ زبردست موقف بیان کر دیا ہے جو انہوں نے ائمہ ضلالت کے مقابلے میں اختیار کیا تھا۔ ہم یہاں قرامطہ کی فتنہ انگیزیوں، صلیبی معرکوں اور تاتاری یورشوں کے ذکر کی بھی ضرورت نہیں سمجھتے کیونکہ یہ حوادث دینی و مذہبی سے زیادہ سیاسی و عسکری رنگ میں رنگے ہوئے تھے اگرچہ انہوں نے بھی عالم اسلامی میں تہلکہ مچائے رکھا تھا۔ اور اسلامی تہذیب کے ان گنت نقوش کھرچ کر رکھ دیئے تھے۔ اور اسلام کا کاروان مدت تک جمود کی وادی میں پڑا رہا۔ یہ حوادث اپنے رنگ ڈھنگ کے لحاظ سے یورپ کی فکری و تہذیبی یلغار سے کافی مشابہت رکھتے ہیں جو گزشتہ صدی کے اواخر اور قرنِ حاضر کے اوائل میں بلادِ اسلام پر وارد ہوئی۔ ان دونوں میں صرف ایک فرق ہے جو بجائے خود بہت بڑی اہمیت رکھتا ہے اور وہی دراصل اس مقالے کا موضوع ہے۔

دنیائے اسلام کا استعمار سے اعجازی جہاد صدیوں کی نیند کے بعد جب مسلمانوں نے آنکھیں کھولیں تو انہوں نے دیکھا کہ ان کی دنیا ہی بدل چکی ہے غیر ملکی حملہ آوروں کے لشکر ہیں جو ان کے شہروں اور بستیوں میں دندناتے پھر رہے ہیں۔ دشمن کے جھنڈے ہیں جو ان کے ارض و سما پر لہرا رہے ہیں استعمار کا کلمہ ہے جو ان کی سرزمین میں پڑھا جا رہا ہے۔ اس استعمار نے بظاہر حمایت اور سرپرستی کا لبادہ اوڑھ رکھا ہے مگر اس کا اصل سہارا سنگین ہے۔ یہ دیکھ کر مسلمانوں کو اپنی اس ابتر حالت پر صبر نہ رہا اور انہوں نے نئے حملہ آور کے آگے جبہ سائی سے انکار کر دیا۔ ان کے اندر استعماری اقتدار کے خلاف وہ جس نام سے بھی موسوم تھا اور جس امپیریلسٹ ملک سے بھی تعلق رکھتا تھا، بغاوت کا آتش فشاں

پھوٹ پڑا جس نے استعمار کی ستمگر قوتوں کو روند ڈالا۔ اس کے نظم و نسق کو تلپٹ کر دیا اور اس کے ہیبت ناک ساز و سامان کو پھونک ڈالا۔ انھیں پھر بھی چین نہ آیا۔ یہاں تک کہ انہوں نے نئے حملہ آوروں کو سمندر کی لہروں تک پہنچا کر دم لیا۔ اور اپنے نام نہاد حامیوں اور اوپر سے ٹھونسے ہوئے مصر پرستوں اور تمام سامراجی فرمانرواؤں پر عظیم الشان کامیابی حاصل کر لی۔ یہ کامیابی مسلمانوں کی ایمانی قوت اور یقینِ صادق کا کھلا ثبوت تھی کیونکہ جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ ایک طرف دشمن نوع بنوع جنگی ساز و سامان اور آتشیں اسلحہ سے لدا ہوا تھا اور دوسری طرف مسلمان مادی افلاس میں گھرے ہوئے تھے اسلحۂ جنگ اور سامانِ حرب سے بالکل خالی تھے تو ان دونوں کے مقابلے کی کوئی توجیہ ہی نہیں کی جا سکتی۔ معلوم ہوا کہ کامیابی کا اصل سہرا دینی غیرت و حمیت اور اسلامی روح کے سر پر ہے جس سے ملتِ اسلامی سرشار تھی۔ وہی روح جو ذلت و رسوائی کی زندگی پر کبھی رضامند نہیں ہو سکتی اور مقامِ عزت کے سوا کسی مقام سے شناسا نہیں۔ وللہِ العزۃُ ولرسولہ وللمومنین۔

سامراج کا فکری استیلاء لیکن عہدِ استعمار کا تصفیہ اور اجنبی تسلط کا انخلا مکمل طور پر عمل میں نہیں آیا۔ اسلامی معاشرے پر سامراجی لشکروں کے جلو میں مختلف فکری و نظری بیماریاں بھی حملہ آور ہوئیں ان بیماریوں نے قوم کے نوجوان دل و دماغ میں گھر کر لیا اور تعلیم یافتہ عنصر کے فکر و نگاہ میں ڈیرے ڈال کر انڈے بچے دینے شروع کر دیئے۔ اور اب اسلامی ممالک اجنبی تسلط و استبداد سے گلو خلاصی کرانے کے باوجود بھی ان بیماریوں سے نجات نہیں پا سکے ہیں یہ بیماریاں وہ باقیات السیئات ہیں جو کہ ہر سو پھیلی ہوئی ہیں۔ نظامِ حکومت میں ان کا غلبہ ہے، تعلیم پر یہ چھائی ہوئی ہیں۔ اقتصادیات کی گردن ان کے ہاتھ میں ہے۔ گھریلو زندگی سے لے کر اجتماعی اور بین الاقوامی نظام پر ان کا جادو سر پر چڑھ کر بول رہا ہے۔ فرد کی حرکت ہو یا جماعت اور ریاست کی سرگرمی، سب پر انہی کی عملداری ہے حاصل یہ کہ ان کی جڑیں گہرائیوں تک اتری ہوئی ہیں اور شاخیں انتہائی بلند و بالا۔ اب خواہ سعی و جہد کا کتنا ہی سرمایہ ان کے ازالہ پر جھونکا جائے ان کا استیصال دشوار نظر آتا ہے الّا یہ کہ نژادِ حاضر — جو مغرب و تہذیبِ مغرب کی پکی مومن اور اس کے ماسوا کی پکی کافر ہو چکی ہے — بساطِ عالم سے

رخصت ہو جائے۔

شیوۂ مغلوب مغربی تہذیب و ثقافت پر شیفتگی نے موجودہ نسل پر غور و فکر کے تمام دروازے مسدود کر دیئے ہیں۔ اور وہ آنکھوں پر ٹھیکری رکھ کر مغربی مظاہرِ حیات کی نقالی کیے جا رہی ہے۔ لیکن اس ناپیدا کنار گرویدگی اور اندھی تقلید کا نتیجہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ "استاذ" کے سامنے گھٹنے ٹیک دیئے جائیں اور تسلیم و رضا کا شیوہ اختیار کر لیا جائے۔ ہمارے ماہرِ اجتماعیات فیلسوفِ اسلام ابنِ خلدون نے اپنے مقدمہ میں اس امر پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے کہ مغلوب غالب کی تقلید کا رسیا کیوں ہو جاتا ہے۔ اس ضمن میں موصوف نے اندلسی مسلمانوں کی اس حالت کی مثالیں بھی بیان کی ہیں جو مغلوبیت اور ذلت کے بعد ان پر طاری ہو گئی تھی۔ موصوف رحمہ اللہ زوالِ اندلس کے وقت موجود نہیں تھے لیکن انہوں نے اسباب و عوامل کی نشاندہی کر کے اس کے زوال کی پیش گوئی کر دی تھی۔ کیا اب اگر یہ کہا جائے تو بے جا ہو گا کہ دنیائے اسلام آج بھی اُسی تجربہ سے گزر رہی ہے جس سے اندلس گزر چکا ہے اور یہ بھی انجام کے اُسی گڑھے کی نذر ہو گی جس کی نذر اندلس ہو چکا ہے؟!

مسلمانوں پر کیا بیتنے والی ہے؟ بے شک آج اسلام کی حالت اندلس سے بھی بدتر ہو چکی ہے لیکن مسلمان اُس وقت جس طرح وطن سے نکال پھینکے گئے تھے آج اُسی طرح اپنے ممالک سے نہیں نکالے جائیں گے ـــــ اگرچہ المیۂ فلسطین کو دیکھ کر یہ بات بھی زیادہ اطمینان سے نہیں کہی جا سکتی ـــ لیکن ان پر جو بیتنے والی ہے، بلکہ بالفعل جو بیت رہی ہے، وہ یہ ہے کہ ان کو پناہ گاہِ مذہب سے نکال دیا جائے گا اور جن شعائر و مظاہر کی بدولت وہ دوسروں پر امتیاز رکھتے ہیں وہ ان سے چھین لیے جائیں گے، اور اسلام کا حلقہ ان کے گلے سے آہستہ آہستہ سرکا لیا جائے گا۔ ان کے ہاتھ کوئی چیز نہیں رہ جائے گی بجز ان تنگ نظر قومیتوں کے جن کے خمیر میں اتحاد سے زیادہ افتراق کا عنصر ہے۔ انہی قومیتوں کی شر انگیزیوں سے وہ ایک دوسرے کے ـــ غیروں کی مدد سے یا اپنے ہی بل بوتے پر ـــ گلے کاٹنے لگیں گے۔ لیکن اس کے بعد وہ کسی شمار و قطار میں نہیں رہیں گے اور اگرچہ ان کی سرزمین سے سامراج کی بساط لپٹ چکی ہے لیکن با ایں ہمہ اُس کا جُوا ان کی گردنوں پر باقی

رہے گا۔

مغربی نظریاتِ حکومت کا جادو سامراجی بیماریوں میں سے سب سے پہلے جس بیماری نے مسلمانوں کے فکر و نگاہ پر یلغار کی ہے وہ نیشنلزم ہے اس بیماری کے اثرات اس وقت نمایاں ہوئے جب اسلامی ممالک نے استعمار کی سیاسی گرفت سے نجات حاصل کر لی ۔۔۔ جو کہ دینی جذبات و احساسات کی بدولت حاصل ہوئی نہ کہ نیشنلزم کی کرامت سے اس حقیقت سے خود ترکی کا انقلاب بھی انکار نہیں کر سکتا ۔۔۔ اور ان کے سامنے نظامِ حکومت کا مسئلہ درپیش ہوا تو مغربی نظامہائے حکومت کا طلسم ہوشربا آگے بڑھا اور نیشنلزم کے ڈسے ہوئے مسلمانوں کے فکر و نگاہ کو مسحور کر گیا۔ چنانچہ کوئی ڈیموکریسی کا دلدادہ بن گیا کسی کو سوشلزم خیرہ کر گئی، کسی کو کمیونزم کی پری نے اپنے شیشے میں اتار لیا اور کوئی ابھی مرحلۂ انتخاب میں ہے۔ رہا اسلامی نظامِ حکومت تو اُسے کسی رہنما اور کسی لیڈر کے حاشیۂ خیال تک میں بھی شرفِ باریابی نہ مل سکا اور اب نام نہاد مسلمان خود نظریۂ اسلام اور دستورِ قرآن کے چہرے کو بھی داغدار کر رہے ہیں اور اسے بھی درآمد شدہ اصطلاحات کا جامہ پہنانا شروع کر دیا ہے۔ ایک صاحب "اسلامی ڈیموکریسی" کا ذکر کر رہے ہیں، دوسرے "اسلامی سوشلزم" کا انکشاف کر رہے ہیں۔ اور وہ دن بھی آیا چاہتا ہے کہ ہمارے کان "اشتراکی اسلام" کا چرچا بھی سننے لگیں گے۔

میں کہتا ہوں کہ اگر خود مغربی ڈیموکریسی اور اس کے مختلف اسکولز آف تھاٹ کو اسلام سے مشابہت دی جاتی تو یہ بھی اسلام پر بہت بڑی بہتان تراشی ہوئی۔ کجا کہ وہ نظامِ حکومت جو اعلیٰ اقدار و برتر خصوصیات میں یکتائے عالم ہے۔ اسے ڈیموکریسی اور سوشلزم وغیرہ ... سے تشبیہ دی جائے۔ قیاس کیجیے جس نظامِ حکومت کا رشوت کے سوا کوئی ضمیر نہ ہو اور مصنوعی انسانی امتیازات کے سوا کوئی قانون نہ ہو کتنا بڑا جرم ہوگا کہ اس کا ایسے نظام سے موازنہ کیا جائے جو صہیبؓ، بلالؓ اور سلمانؓ کو ابوبکرؓ، عمرؓ اور علیؓ کے برابر کھڑا کرتا ہو۔

یورپ کی عاجزانہ نقالی ایک قدم آگے بڑھیے، پورے عالم اسلامی میں جب اسلامی نظامِ حکومت کے لیے دروازے بند کر دیئے گئے تو اب ہمارے بھائیوں کو ملک کے لیے فوجداری و دیوانی

قوانین کی احتیاج لاحق ہوئی چنانچہ انہیں اس میں کوئی تردد نہ ہوا، فوراً لپکے اور مغرب کے قوانین سے اور مغرب کے مجلہ ہائے احکام سے اخذ و اقتباس شروع کر دیا۔ بلکہ لفظ بہ لفظ نقل مارنے لگے — کیونکہ جیسا کہ میں پہلے گزارش کر آیا ہوں، کم کوشی اور بے بسی نے ان کے اندر اخذ و اقتباس کی اہلیت بھی باقی نہیں رہنے دی انہیں صرف مکھی پر مکھی مارنا آتا ہے اور نوبتِ تقلید بایں جا رسید کہ وہی حاکم جو پہلے اللہ کے نام سے فرمان صادر کرتا تھا۔ اب غیر اللہ کے نام سے صادر کرنے لگا — کیوں؟ اس لیے کہ استاذ مغرب نے اپنے قوانین سے دین و عقیدہ اور سماوی شریعت کو فارغ خطی دے دی ہے نقال جو اپنے استاد سے گیا گزرا ہوتا ہے کیوں نہ ایسا کرتا! — صرف ایک "الجھن" اس دستبرد سے محفوظ رہ گئی۔ یہ پرسنل لا کی الجھن ہے غیر ملکی حکمران نے پرسنل لا کو (اپنے مصالح کے پیش نظر) درخور اعتنا نہیں سمجھا اس لیے اس کی قانون سازی اور دفعات بندی نہیں کی۔ بیچارے مسلمانوں کو یہ کوہ کنی خود ہی کرنی پڑی اور پرسنل لا کی ترتیب و تبویب کا فرض خود ہی انجام دینا پڑا۔ اور یہی وہ خدمت ہے جس پر مسلمان جامے سے باہر ہو گئے ہیں اور فخر سے کہتے ہیں "ہم نے اسلامی قانون کے اندر عظیم ترین اصلاحات کی ہیں ..... اور یہ بیچاری مسلمان عورت جس کے حقوق چھن چکے تھے اور جس کی آبرو کو بٹہ لگ چکا تھا، ہم نے اُسے عدل و انصاف سے بہرہ مند کیا ہے۔"

ترقیٔ نسواں کا دعویٰ اور اس کی حقیقت تسلیم کہ مسلمان عورت کے حقوق چھین لیے گئے تھے اور اس کی آبرو کو بٹہ لگ چکا تھا۔ لیکن کب؟ — جب آپ کی عدل گستری اور انصاف پروری کا سایہ اس پر پڑا! — وہ وقت بھی تھا کہ بلادِ اسلامیہ میں کوئی مظلوم بیوہ نہ ملتی تھی اور کوئی دوشیزہ حرماں نصیبی کی زندگی نہ گزار رہی تھی۔ اور (آپ کی "اصلاحات" کے بعد) یہ وقت بھی ہے کہ ممالکِ اسلامیہ نظر فریب تہذیب کے علم بردار ممالک کے اُسوہ میں ایسی عورتوں سے بھرے پڑے ہیں جو خاوندوں کی سرپرستی سے محروم ہیں۔ پہلے دوشیزہ کی جستجو ہوتی تھی اور آج دوشیزہ خود خاوند کی جستجو میں ماری ماری پھرتی ہے۔ پہلے پاکیزگی اور طہارت اسلامی معاشرے کا شعار تھے، آج فسق و فجور اور ازدواجی خیانت اس کی طبیعت ثانیہ بن چکے ہیں۔ مسلمان خاتون — جو تر و تازہ اچھوتے شگوفے کے مانند تھی

جس کی طرف مجرمانہ ہاتھ تو کجا، نگاہِ بد تک اٹھائی نہیں جا سکتی تھی ــــ اب مجالسِ فسق اور رقص پارٹیوں کی روحِ رواں بنی ہوئی ہے۔ جب باہر نکلتی ہے تو ساق و سینہ کی عریانی دعوتِ نظارہ دے رہی ہوتی ہے۔ جسم کے فتنہ انگیز حصے بھڑک رہے ہوتے ہیں۔ قرآن کی تعلیم اور اسلام کے راستے سے کھلم کھلا انحراف ہوتا ہے اور آڑ لی جاتی ہے شخصی آزادی کی، ترقی و بیداری کی اور ترکِ حجاب کی، درآنحالیکہ حجاب شہری عورتوں کی عام عادت میں داخل تھا جسے انہوں نے شر و فتنہ سے بچاؤ کے لیے بطور سپر اختیار کیا ہوا تھا اور ایک غیر شناسا لباس ہوتا تھا جسے شریف خواتین قضائے حاجت کے وقت شر پسندوں اور چھچھوروں کے تعرض سے محفوظ رہنے کے لیے پہننے پر مجبور ہوتی تھیں۔ لیکن بے محابا نمائش، یہ بدکاریاں اور یہ مرد اور عورت کا باہوں میں باہیں ڈال کر چلنا، یہ رقص و سرود ان کی روادار نہ شریعتِ اسلام ہے اور نہ قانونِ اخلاق۔

دینی تعلیم کی زبوں حالی | تعلیم کے میدان میں کیا ہو رہا ہے؟ ــــ لادینیت تعلیم کی رگ رگ اور ریشے ریشے میں گھس چکی ہے۔ اور ہم دینی تعلیم کو دنیوی تعلیم کے اندر مدغم کرنے کے لیے سب انسانوں سے زیادہ آرزومند ہیں۔ اور دنیوی تعلیم کا یہ حال ہے کہ دین کے نظری اور عملی اصولِ تربیت سے بالکل بے حظ ہو چکی ہے۔ دینی تعلیم کے ادارے جن دنوں سامراجی بغض کا ہدف بنے ہوئے تھے انہیں روحِ آزادی پھونکنے والے خیالات کے قلعے اور زبان و ادب کے آشیانے سمجھا جاتا تھا، وہی آج ان کم کوشوں اور کوتاہ ہمتوں کی نگاہ میں غداری کے گڑھ اور قدامت پرستی کی پناہ گاہیں قرار پا چکی ہیں۔ ان کے حق میں زمانہ کی گردشوں کا انتظار کر رہے ہیں۔ ان کا تمسخر اڑاتے ہیں اور ان کے وابستگان کی ہر موقع و مناسبت سے پگڑی اچھالی جاتی ہے۔

سُود اور دیگر محرّمات کا عام چلن | اقتصادی اور مالیاتی نظام کے بارے میں تو دنیائے اسلام نے مغربی نظریات کی پیروی کی قسم اٹھا رکھی ہے۔ اور خاص طور پر ان سرمایہ دار آبادیوں کی تقلید کی جا رہی ہے جن کی سج دھج احتکار، استحصالِ زر اور شرمناک معاشی لوٹ کھسوٹ پر قائم ہے اور تمام تر بوجھ پسماندہ طبقات اور صارفین کی گردنوں پر ہے اور سودی کاروبار کے ذریعے، قمار خانوں

کے لیے لائسنس جاری کر کے اور "پاکیزہ" و "غیر پاکیزہ" تفریح گاہیں قائم کر کے دولت جمع کی جاتی ہے۔ حالانکہ ہم دیکھتے ہیں کہ خود یورپ کے مشرقی ممالک میں سود کاری ممنوع ہے۔ بیشتر ترقی یافتہ ممالک میں قمار بازی ناجائز ہے اور امریکہ میں تو ہوور کے عہدِ صدارت میں شراب بھی ممنوع قرار دے دی گئی تھی اور اس کے بعد اس ممانعت کو جن اسباب کی بنا پر ختم کیا گیا ہے ان کا تعلق نظریۂ "تحریم" سے نہیں ہے لیکن ہمارے ملک میں اگر کوئی قانون ساز جرأت کر کے مے نوشی کی ممانعت کے لیے بعض شرعی احکام طے بھی کر دے تو مسلمانوں کو مے فروشی سے روک دینا اُس کے بس کی بات نہیں ہے۔ حالانکہ شارع علیہ السلام کا ارشاد ہے کہ ان اللہ اذا حرم شیئاً حرم ثمنہ (جب اللہ تعالیٰ کسی چیز کو حرام ٹھہرا دیتا ہے تو اس کی قیمت کو بھی حرام ٹھہرا دیتا ہے)۔ بات اتنی ہی نہیں، بلکہ ملک کے اندر یا باہر جب کبھی کسی پارٹی کا اہتمام کیا جاتا ہے تو اس کا سب سے بڑا عنصر شراب ہوتی ہے۔ اسلام خواہ اپنی کتنی ہی ناک رگڑتا رہے مگر یہ لوگ (مقلدینِ مغرب) اہلِ کفر کی خوشنودی کے لیے ـــ استغفر اللہ! ـــ بلکہ اپنی بدترین نفسانی خواہش کی تسکین اور آتش بلانوشی کو ٹھنڈا کرنے کے لیے اسے شاملِ تفریح کیے بغیر نہیں رہ سکتے۔ میرے ایک دوست م۔کوبی مے، جو ہالینڈ کے مسلمان ہیں، مجھے بتایا کہ ہالینڈ کے دارالحکومت میں ایک بار وہاں کے مسلمانوں نے ایک مسلمان سفارت خانے میں شراب کا دَور چلتے دیکھا تو اس پر اعتراض کیا۔ سفارت خانے کی طرف سے انہیں یہ جواب دیا گیا کہ "شراب کا اہتمام غیر مسلم شرکاء محفل کی خاطر داری کے لیے کرنا پڑتا ہے"۔ مسلمانوں نے کہا، "آخر اسرائیلی سفارت خانہ اپنی پارٹیوں میں خنزیر کا گوشت کیوں نہیں پیش کرتا کیا وہ دوسروں کی خاطر داری سے نابلد ہے۔ بلکہ خود غیر مسلموں کو جس قدر ان کا پاسِ خاطر ہے تمہارا ان سے زیادہ نہیں ہے؟"

اصلاح کے سنگہائے راہ یہ ہے وہ روگ جو دورِ حاضر نے اسلام کو دیا ہے۔ اور اس روگ سے اسلام کے افاقہ کی اس وقت تک کوئی امید نہیں کی جا سکتی جب تک دنیائے اسلام میں بست و کشاد کی کنجیاں اس اسلام اور مسلمانوں سے "اجنبی" نسل کے ہاتھ میں رہیں گی اور یہ بد طینت دم چھلے چھائے رہیں گے جنہیں خود اعدائے اسلام نے پال پوس کر رکھا ہوا تھا تاکہ خطرات کے موقع پر ان کو ڈھال بنا کر

اپنی مدافعت کر سکیں۔ اور اسلام کا مسخ یہی ہے کہ اس کے اصولوں کا غلط تصور قائم کر لیا گیا ہے اور اس کے چند احکام کا اُدھورا انفاذ کر کے بعض نام نہاد مسلمان اہلِ ایمان کے گروہ کو یہ باور کرانے کی کوشش کرتے ہیں کہ وہ اسلام پسند مصلحین اور دیندار مجددین کے زمرہ سے تعلق رکھنے والے ہیں۔

موجودہ بگاڑ کی اہمیت اور دعوتِ جہاد | ماضی میں تو مسلمان پیش آمدہ خطرات کو فوراً بھانپ جاتے تھے اور یکمشت ہو کر اُن کا سدِ باب کر دیتے تھے۔ لیکن اب شیطان نے تلبیس کی ایسی چال چلی ہوئی ہے کہ وہ چیزوں کو غلط لیبل لگا کر مسلمانوں کے سامنے پیش کرتا ہے۔ اور شیطان کا ایجنٹ انارکسٹ گروہ مسلمانوں کے اندر اپنے مکر و فن کے جال پھیلائے ہوئے ہے۔ ان کے اخلاق کو بگاڑ رہا ہے اور ان کی ہمتوں کو پست کر رہا ہے۔ چنانچہ اب مسلمانوں کی اکثریت بندگیٔ نفس میں مبتلا ہو چکی ہے۔ اور وہ کسی ایسی چیز کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں جو اس کی ہوس کی تائید نہ کرتی ہو۔ اسی کمزور پہلو نے انہیں گرفتار معصیت کر رکھا ہے۔ ورنہ اگر یہ حوصلوں کے مضبوط ہوتے تو شیطان کے جال اور ملحدین کے پروپگنڈے کا شکار نہ ہو جاتے۔ حالات اب نزاکت اختیار کر چکے ہیں۔ ان کو سنبھالنے کے لیے مؤثر اقدام کرنا چاہیے۔ دینی رہنماؤں اور داعیوں کا فرض ہے کہ وہ مسلمانوں کو سر پر منڈلانے والے خطرات سے آگاہ کرنے کے لیے اپنی فوج کو منظم کریں اور لاگ لپیٹ رکھے بغیر لوگوں پر واضح کر دیں کہ جس روش پر اب وہ چل رہے ہیں وہ اسلام سے ہٹی ہوئی ہے اور اگر وہ فی الواقع دین کی رسّی کو تھامنے کا پختہ عزم رکھتے ہیں تو اپنے سلف صالحین کی زندگیوں کی جانب رجوع کریں اور اپنی خواہشاتِ نفس کو تج کر از سرِ نو امانتِ اسلام کا بار اٹھانے کی تیاری کریں، اس راہ میں ان تمام چیزوں سے دستبردار ہونا پڑے گا جن سے اللہ تعالیٰ نے منع کیا ہے اور اسلام کی شوکتِ رفتہ کو زندہ کرنے اور اللہ کا بول بالا کرنے کی نیت سے انہیں مال و جان کی بازی لگا دینا ہو گی ــــــ اور اُس دن انہیں یہ حق حاصل ہو گا کہ وہ اپنے وطن کی آزادی اور اپنی قوم کی نجات پر فخر کر سکیں۔ ویومئذ یفرح المؤمنون بنصر اللّٰہ۔